المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

# راہِ معرفت

- دینی سوالات پوچھنے کی حدود
- نامعلوم امور کا بے جا انکار

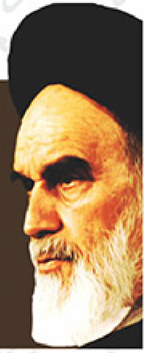

**شہید مطہری** اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدو جہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق و غوامض کی بصیرت و معرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ

**شہید مطہری** انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ای حفظہ اللہ

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

راہ معرفت (۲)

# ۱۔ دینی سوالات پوچھنے کی حدود

## اہداف:

۱۔ دینی سوالات پوچھنے کی حدود کیا ہیں؟

۲۔ کن سوالات کی اسلام میں مذمت بیان کی گئی ہے؟

۳۔ کونسے سوالات کرنا چاہئیں؟



بعض باتوں کا پوچھنا اور ان کے متعلق سوال کرنا دینی نقطۂ نظر سے واجب ہے اور بعض باتوں کو پوچھنا گو بظاہر ایک مذہبی بات نظر آئے حرام ہے۔ ایسے سوالات کے جواب میں وقت ضائع کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔ ایسے موقعوں پر سکوت اور ان سوالوں کی طرف توجہ نہ کرنا ہی دینی فریضہ ہے۔ قرآن کریم بعض آیات میں صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جو بات تم نہیں جانتے ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنتُمْ لاتَعْلَمُونَ (الانبیاء:۷)

کچھ دوسری آیتوں میں بعض باتیں تو جن کی نوعیت مذہبی ہو پوچھنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

لاَ تَسْئَلُوا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ وَاِنْ تَسْئَلُوا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَلَكُمْ۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ O قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ

ان باتوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر بتلائی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں اور اگر تم پوچھو گے ان کے بارے میں ایسی حالت میں قرآن نازل کیا جارہا ہے تو وہ باتیں تم پر ضرور ظاہر کردی جائیں گی۔ جو کچھ تم پوچھ چکے ہو اللہ نے اسے معاف کردیا ہے۔ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے بھی لوگوں نے (اپنے وقت کے پیغمبروں سے) ان باتوں کو پوچھا، پھر وہ اس کے منکر ہو گئے۔ (مائدہ:۱۰۱، ۱۰۲)

## پوچھنے کی جبلی خواہش:

پوچھنا انسان کی جبلت ہے اور اس کی ذہنی پختگی کی علامت ہے۔ آدمی کو پوچھنے کا خیال اس وقت آتا ہے جب اس کے ذہن میں کسی چیز کے بارے میں شک پیدا ہوتا ہے اور مجموعی طور پر شک کا پیدا ہونا ایک طرح کی ذہنی پختگی ہے کیونکہ جانوروں کو شک نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شک سے بڑھ کر یقین کے مرتبے کو پہنچ گئے ہیں بلکہ وہ شک کے نیچے کے درجہ پر ہیں نہ کہ اس کے اوپر کے درجہ پر۔ بچہ تقریباً تین سال کی عمر سے اور کبھی کبھی اس سے بھی پہلے ماں باپ اور انا وغیرہ سے اپنے اردگرد کی چیزوں کے بارے میں پوچھنے لگتا ہے اور ان میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ ہر وقت پوچھتا رہتا ہے، یہ کیا ہے، وہ کیا ہے۔ یہ چیز کس لیے ہے وغیرہ وغیرہ۔ ماہرین نفسیات تین سال کی عمر کو پوچھنے کی عمر کہتے ہیں۔

بچوں کی تربیت سے متعلق مسائل میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ماں، باپ اور دوسرے لوگ جن کے ہاتھوں میں بچوں کی تربیت ہے وہ ان کے سوالات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔ پوچھنا چونکہ بچے کی جبلت میں ہے اس لیے اس پر روک نہیں لگانی چاہیے۔ بچوں کو پوچھنے سے منع نہیں کرنا چاہیے، نہ ہی ان سے جھوٹ بولنا چاہیے بلکہ ہر بات کا ان کی سمجھ کے مطابق جواب دے کر ان کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ یہی حال بڑوں کے سوالوں کے جواب کا بھی ہے۔ ان کو بھی سخت جواب نہیں دینا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ چپ رہو۔ فضول باتیں مت کرو، ہاں یہ فرق البتہ ہے کہ بڑوں کو یہ بتلایا جا سکتا ہے۔

کوئی شخص سوال اس لیے کرتا ہے کہ کوئی بات اس کو معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس کو معلوم نہیں گویا اس کے عدم علم میں بھی علم کی آمیزش ہوتی ہے۔ اور اپنے عدمِ علم کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہ نامعلوم بات اس کو معلوم ہوتی تو وہ اس کے بارے میں سوال نہ کرتا۔ آدمی اس وقت کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے جب وہ اسے نہیں جانتا، اس لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں انسان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کا جہل بسیط ہے اور دوسرے جانداروں کا جہل مرکب۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنی ناواقفیت کا علم اور احساس ہو سکتا ہے۔ جب وہ یہ جانتا ہے کہ نہیں جانتا تو وہ پوچھتا ہے۔ تحقیق اور جستجو کرتا ہے، اس کے برخلاف چونکہ جانوروں کا جہل مرکب ہے اس لیے وہ جو کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نہیں جانتے۔ اسی لیے وہ اس کی تحقیق بھی نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

## پوچھنا علم کی کنجی ہے:

سوال علم کی کنجی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: **الا ان مفتاح العلم السوٴال** یعنی یاد رکھو کہ علم کی کنجی سوال ہے۔ اس کے بعد امام نے برجستہ ایک شعر سنایا۔

**شفاء العمیٰ طول السؤال و انما**
**طمام العمیٰ طول السکوت علیٰ الجھل**

یعنی باطنی نابینائی کا علاج یہ ہے کہ آدمی جو بات نہیں جانتا اسے بغیر کسی جھجک کے پوچھ لے، یہ کور باطنی کی انتہا ہے کہ آدمی کو صحیح بات معلوم نہ ہو اور اس کے باوجود وہ چپ رہے اور نہ پوچھے۔



محقق کا کام جستجو اور تحقیق ہے اور مبتدی اور طالبعلم کا کام یہ ہے کہ اپنی مشکلات کیلئے اس شخص سے رجوع کرے جس نے تحقیق کی ہو۔ طالب علم کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے استاد کی مدد لے اور استاد سے پوچھے اور بیمار کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ طبیب سے رجوع کرے۔

## کیا پوچھنا چاہیے؟:

اس موقع پر ایک نکتہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ پرسش اور سوال اچھی بات ہے اور انسان کی پختگی کی دلیل لیکن سوال دراصل کسی اور چیز کی محض تمہید ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ تمہید ہوتا ہے تحقیق کی اور کبھی عمل کی۔ جو لوگ کسی علمی یا تاریخی یا دینی موضوع کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں ان کیلئے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان لوگوں سے پوچھیں جن کو ان کے بارے میں واقفیت ہو۔ ایک مستعد طالبعلم کے سوالات کی نوعیت یہی ہے۔ کبھی پوچھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پوچھنے والا کسی کام کے کرنے کا طریقہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ایک بیمار طبیب سے سوالات کرتا ہے اور ہدایات لیتا ہے، یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب ذہنی الجھنوں کے مریض نفسیاتی معالجوں سے یا روحانی بیمار معلمان اخلاق سے اپنی شکایات بیان کرتے ہیں۔

اگر سوال کا مقصد علم میں اضافہ یا کوئی عملی طریقہ معلوم کرنا نہ ہو تو محض کسی بات کا معلوم نہ ہونا اس کا کافی جواز مہیانہین خرتا کہ کوئی شخص اپنا اور کسی دوسرے کا وقت غیر ضروری سوالات کر کے ضائع کرے کیونکہ جو باتیں معلوم نہیں ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ جوں ہی آدمی کے بچے کو ذرا تمیز آتی ہے، اس کو اپنے اردگرد استفہام کی علامتیں پھیلی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں، جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے ان علامتوں میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اگر ایک سوال کا جواب ملتا ہے تو دس سوال اور ابھر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو واقعی عالم ہیں اور جن کو علم سے کچھ مَس ہے، وہ اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ جاہل سمجھتے ہیں کیونکہ جتنا کچھ وہ معلوم کرتے جاتے ہیں اتنی ہی غیر معلوم باتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک عالم کے علم کی آخری حد یہی ہے کہ وہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرے۔

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر

عالم کو تو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

(حالی)

اگر آدمی یہ چاہے کہ وہ ہر بات پوچھ لے تو یہ ممکن نہیں، اس لیے ان ہی باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو علم یا عمل کے لحاظ سے ضروری اور مفید ہوں۔

## سوالات میں افراط وتفریط:

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ لوگ اکثر سوالات میں افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں یعنی یا تو حد سے زیادہ سوال کرتے ہیں یا ضرورت سے بہت کم۔ کچھ لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کا کام ہی پوچھتے رہنا ہے خصوصاً بعض لوگ دینی مسائل کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اپنے خیال میں یہ چاہتے ہیں کہ ہر بات کی تہہ تک پہنچ جائیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دین کو تو چھوڑیے کہ اس کا سرچشمہ تو محسوسات سے بہت بلند ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتا کہ اس دنیا کی محسوس اور نظر آنے والی چیزوں کے متعلق اس نے سب کچھ معلوم کرلیا ہے۔

کچھ لوگ پوچھنے میں تفریط سے کام لیتے ہیں۔ ان پر ایک طرح کی سستی غالب ہے۔ ان میں تحقیق اور تجسس کی کمی ہے۔ وہ ضروری سوال بھی نہیں پوچھتے، کچھ لوگ پوچھنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ پوچھنا ایک طرح سے اپنی لاعلمی کا اقرار ہے۔ یہ لوگ تمام عمر جہالت کی تاریکی میں رہتے ہیں حالانکہ مناسب یہ ہے کہ اگر آدمی کو کوئی بات نہ ہو اور اس کو جاننا ضروری ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھ لے خواہ وہ اس سے چھوٹا ہو یا بڑا، درجہ میں کم ہو یا زیادہ۔

دینی روایات میں ایسے شخص کی سخت مذمت کی گئی ہے جو سیکھنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھے۔ کہا گیا ہے کہ عالم کیلئے ضروری ہے کہ اپنے علم سے کام لے اور جاہل کیلئے ضروری ہے کہ اسے پوچھنے میں عار نہ ہو بلکہ پوچھنے اور سیکھنے کو فخر سمجھے اور خیال نہ کرے کہ اس میں مجھے چھوٹا بننا پڑتا ہے:

**عالم مستعمل علمه و جاهل لا یستنکف من ان یتعلم**

اعتدال کی بات یہ ہے کہ پہلے آدمی یہ طے کرے کہ کن چیزوں کا جاننا اس کیلئے ضروری ہے اور کن



چیزوں کا جاننا غیر ضروری یا ناممکن ہے۔ جن باتوں کا جاننا یا ان پر عمل کرنا اس کیلئے ضروری ہو، ان کی ترجیحات متعین کر کے ان لوگوں سے پوچھ لے جو جانتے ہیں لیکن یہ احتیاط رکھے کہ پوچھنا ہی اس کا مشغلہ اور شوق نہ بن جائے۔

گفتگو کی ابتداء میں، مَیں نے امام باقرؑ کی ایک حدیث نقل کی تھی کہ سوال کی خوبی بتلاتے ہوئے آپ نے فرمایا: **الا ان مفتاح العلم السوال**، اب ہم آپ کی ایک اور حدیث ضرورت سے زیادہ اور بیجا سوال کرنے کی مذمت میں نقل کرتے ہیں۔

امام محمد باقرؑ فرمایا کرتے تھے، جب میں تم سے حدیث بیان کروں تو مجھ سے پوچھ لیا کرو تا کہ اس کی تائید میں کسی قرآنی آیت کا حوالہ دے سکوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، قرآن کریم کی تعلیمات پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا: رسول خداؐ نے تین چیزوں سے منع کیا ہے: فضول گوئی، اسراف بیجا اور کثرتِ سوال، کسی نے آپ سے پوچھا کہ جن تین باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، یہ قرآن میں کہاں ہیں؟

امام محمد باقرؑ نے قرآن کی تین آیات تلاوت کیں جن میں سے ہر ایک میں ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کو منع کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ آیت جس میں ارشاد ہے: **لا خیر فی کثیر من نجوٰهم الا من امر بصدقة او معروف او اصلاح بین الناس**، ان کی آپس کی گفتگو میں عموماً کوئی اچھی بات نہیں ہوتی، ہاں، جب کوئی صدقہ دینے کیلئے کہے یا کسی اور نیک کام کیلئے کہے یا لوگوں میں صلح و صفائی کی بات کرے۔ اس آیت میں فضول اور لغو گفتگو کی ممانعت کی گئی ہے۔

ایک دوسری آیت ہے:

**وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوٰلَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا** (سورہ نساء آیت۔ ۵)

تم اپنے اموال جن سے تمہاری زندگی کے کام چلتے ہیں سفیہہ اور کم عقل لوگوں کے ہاتھ میں نہ دو، چاہے وہ مال خود انہی کا کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر مال ان لوگوں کو دے دیا گیا تو وہ اپنی بے عقلی کی وجہ سے اس کو ضائع کر دیں گے۔

اس آیت میں اگرچہ بات کم عقل شخص کے مال کی ہے لیکن اس کو اَمْوٰلَكُمْ یعنی تمہارے مال کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر شخص کے ذاتی مال کا بھی کسی نہ کسی طرح معاشرے سے تعلق ہے اور اس پر

معاشرے کا حق ہے۔اس لیے کسی کو اپنے ذاتی مال کو بھی تلف کرنے اور بلا وجہ خرچ کرنے کا حق نہیں۔

ایک اور آیت ہے: **لاَ تَسئَلُوا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبدَلَکُمْ تَسُؤ کُمْ**، ان باتوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر تمہیں بتلا دی جائیں تو تم کو نا گوار ہوں۔

اس آیت میں بعض قسم کے سوال پوچھنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ ہے اسلام کی سوچ کہ اسلام زیادہ سوال کرنے اور ہر وقت پوچھتے رہنے سے منع کرتا ہے۔ایک طرف تو اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ جو بات تمہیں معلوم نہ ہو اور اس کا جاننا ضروری ہو تو ضرور پوچھو اور اس میں ذرا بھی سستی نہ کرو۔دوسری طرف فضول اور بے کار سوال کرنے سے روکتا ہے۔

مذہب میں بہت سے اُصول اور عقائد شامل ہیں جن کے بارے میں ہر شخص کو خود براہ راست تحقیق کرنی چاہیے اور معلومات حاصل کرنے کا شوق ہونا چاہیے۔اگر کسی کو واقعی شوق اور دلچسپی ہو اور وہ کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ خود اس کی دستگیری اور رہنمائی کرے گا۔

**وَ الَّذِینَ جَاھَدُو افِینَا لَنَھدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا** (سورہ عنکبوت۔آیت ۶۹)

جو ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔اُصول اور عقائد کے علاوہ مذہب میں اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات بھی ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان کیلئے ضروری اور لازمی ہے۔یہ ایسے احکام ہیں جن کو سیکھنا اور ان کے متعلق پوچھنا ضروری ہے۔

# سوالات

سوال ۱۔قرآن مجید میں کس نوعیت کے سوالات کرنے سے منع کیا گیا ہے؟

سوال ۲۔شک کا پیدا ہونا انسان کی ذہنی پختگی کا باعث ہے، وضاحت کیجئے؟

سوال ۳۔بچوں کی تربیت سے متعلق ان کے سوالات کے بارے میں والدین کو کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

سوال ۴۔امام محمد باقرؑ کی حدیث کے مطابق علم کی کنجی کیا چیز ہے؟

سوال ۵۔سوالات کرنے میں افراط و تفریط کرنے میں کیا حرج ہے؟

سوال ۶۔اُصول اور عقائد کے بارے میں تحقیق کیلئے ایک فرد کو کیا کرنا چاہیے؟

# ۲۔ نامعلوم امور کا بے جا انکار

## اہداف:

۱۔ کیا نامعلوم امور کا بے جا انکار کرنا چاہیے؟

۲۔ انسان کی کیا قدر ہے؟

۳۔ انسان کے خدا سے دو عہد کونسے ہیں؟



مشہور حدیث ہے کہ علم کے تین درجے یا مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے میں آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ خود بینی کا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں جب اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسے اس کائنات کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی معلومات کو اس کارخانۂ قدرت کی وسعت اور عظمت کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ ایک تواضع کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت پسندی اور کائنات کے صحیح تصور کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں آدمی صرف اپنی معلومات کو نہیں دیکھتا بلکہ کائنات پر نظر ڈالتا ہے اور اس سے معلومات کا اندازہ لگاتا ہے۔ بالآخر تیسرا مرحلہ وہ آتا ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ **علم انه لا یعلم شیئاً**۔

یہ حیرت کا مرحلہ ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں آدمی کو اپنی فکری نارسائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنے فکری پیمانوں سے اس عظیم کائنات کا اندازہ لگانے سے قاصر ہے۔ اس کے علم و فکر کے پیمانے صرف اس کی محدود زندگی کے ماحول کیلئے کارآمد ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میرا خیال ہے یہ شعر مولانا رومی کا دیوانِ شمس تبریز میں ہے:

**حاصل عمرم سه سخن بیش نیست**

**خام بدم، پخته شدم ،سوختم**

رومی نے اپنے روحانی و ذہنی سلوک کے مختصراً تین مرحلے بیان کیے ہیں۔ خامی کا دور، پختگی کا دور اور سوختگی کا دور۔ خامی کا دور غرور، تکبر اور اپنے آپ کو عالم سمجھنے کا دور ہے لیکن جب آدمی پختگی یا سوختگی کے دور تک پہنچ جائے تو اور بات ہے۔

## ناقص علم پر غرور:

انسان کبھی اپنے مال کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔ دولت اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دولت سے اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگانی جاوید بھی حاصل کر سکتا ہے۔

**یحسب ان ماله اخلده**

کبھی انسان اپنی عزت اور قوت کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔ اپنے مرتبہ اور مقام کی بڑائی اس

طرح اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے کہ وہ زمین میں شر و فساد کا باعث بن جاتا ہے اور آخر میں کُوسِ انا ربکم الاعلیٰ بجانے لگتا ہے۔

اسی طرح آدمی اپنے علم پر بھی غرور کرنے لگتا ہے جس طرح دولت آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اسی طرح علم سے بھی آدمی کا دماغ خراب ہو سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دولت کی زیادتی دماغ خراب کرتی ہے اور علم کی کمی سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ مگر علم کی بات مختلف ہے۔ ناقص علم سے علم کا نہ ہونا بہتر ہے کیونکہ ناقص علم ایک طرح کا نشہ ہے جو دماغ کو خراب کر دیتا ہے۔ دولت اور مرتبہ بھی دماغ خراب کرتے ہیں اور نشہ پیدا کرتے ہیں لیکن ان کی زیادتی سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ برخلاف علم کے کہ اس کی کمی ایسی مستی اور نشہ پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں آدمی حقائق کو جھٹلانے لگتا ہے۔ میں یہاں امام صادقؑ کی ایک اور حدیث نقل کرتا ہوں۔

## انسان کے خدا سے دو عہد:

امام صادقؑ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کسی بات کی بیجا تصدیق یا بیجا تکذیب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

**أَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِم مِّيثَاقُ الۡكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الۡحَقَّ**

آیا ان لوگوں سے آسمانی کتاب میں پختہ وعدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے بارے میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہیں گے۔ (الاعراف: ۱۶۹)

اپنی طرف سے یہ نہیں کہیں گے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے یا اللہ نے اس معاملے میں یہ حکم دیا ہے اور اس معاملے میں وہ حکم دیا ہے جہاں اللہ نے کوئی حکم نہیں دیا وہ بھی سکوت کریں۔ یہ نہیں کہ اپنی طرف سے بدعتیں تراش لیں اور احکام الٰہی کے نام سے خود ہی حکم گھڑ لیں۔

جہاں اللہ نے کوئی حکم نہیں دیا اور لوگوں کو مصلحتاً آزاد چھوڑ دیا ہے، بعض دفعہ انسان اپنی طرف سے کوئی حکم وضع کر لیتا ہے اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے یا کوئی برا کام جو اس کی خواہش نفسانی کے مطابق ہوتا ہے، کرتا ہے اور اپنی طرف سے حکم گھڑ کر کہتا ہے کہ اللہ نے ایسا حکم دیا ہے۔ سورہ اعراف کی آیت ۲۸ میں ہے:



**وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدۡنَا عَلَيۡهَا آبَاءَنَا وَاللّٰهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلۡ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأۡمُرُ بِالۡفَحۡشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ**

جب وہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ہرگز کسی گندی بات کا حکم نہیں دیتا۔ آیا تم اللہ پر بغیر جانے بوجھے الزام لگاتے ہو۔ (اعراف۔ آیت ۲۸)

ایک عہد تو یہ ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے کہ جب تک کسی بات کا علم اور یقین نہ ہو یہ ہرگز نہ کہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ ایک دوسرا عہد وہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے:

**بَلۡ كَذَّبُوا بِمَا لَمۡ يُحِيطُوا بِعِلۡمِهِ وَلَمَّا يَأۡتِهِمۡ تَأۡوِيلُهُ** (سورہ یونس۔ آیت ۳۹)

جن مسائل سے وہ پوری طرح آگاہ نہیں اور جن مسائل کی روح سے ناواقف ہیں، بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ ہمیں یہ مسائل معلوم نہیں اور ہم ان کو نہیں سمجھتے، غرور اور خود پسندی کی وجہ سے ان کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ محض نہ جاننے کی وجہ سے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔

قریب قریب اسی مضمون کے شیخ الرئیس بوعلی سینا کے بھی دو فقرے ہیں بے دلیل بات مان لینے کے متعلق کہتے ہیں:

**من تعود ان یصدق بغیر دلیل فقد انخلع عن الفطرۃ الانسانیۃ**

جس کی عادت یہ ہو کہ جو سنے بغیر دلیل مان لے، ایسا شخص فطرتِ انسانی سے خارج ہے۔ وہ درحقیقت انسان ہی کہلانے کا مستحق نہیں۔ دلیل کے باوجود نہ ماننے کے متعلق کہتا ہے۔

**کل ما قرع سمعک من الغرائب فذرہ فی بقعۃ الامکان مالم یذدک عنہ قائم البرھان**

یعنی کسی بات کے صرف عجیب معلوم ہونے کی وجہ سے اس کا انکار نہ کرو۔ البتہ اگر اس کے ناممکن ہونے کی کوئی عقلی دلیل موجود ہو تو دوسری بات ہے۔

## اپنی حد کو پہچاننا:

جس طرح ہر شخص کا جسم محدود ہے، اسی طرح اس کی روح، عقل اور علم کی بھی ایک حد ہے۔ علم اور عقل بھی غیر محدود نہیں۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اپنی حد میں رہے، اس سے تجاوز نہ کرے۔

**العالم من عرف قدرہ**، دانا وہ ہے جو اپنی حد کو پہچانتا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی معلومات بہت وسیع ہوں۔ اسے ریاضی، طبعیات اور عمرانیات کے مسائل سے گہری واقفیت ہو۔ اسے ساری دنیا کا علم ہو، تاریخ سے خوب واقف ہو۔ گزشتہ حالات و واقعات سے باخبر ہو، بہت سے معاملات کا صحیح اندازہ ہو لیکن اسے خود اپنی حدود کا اندازہ نہ ہو۔ وہ اپنی حدود سے ناواقف ہو، اس نے اپنی روح اور فکر کا اندازہ نہ لگایا ہو۔ اپنی حدود سے ناواقفیت ہزار نادانیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسلمہ حقائق کی تکذیب پر اکساتی اور بیجا غرور پیدا کرتی ہے۔

ہماری سمجھ کی ساخت ایسی ہے کہ کوئی حقیقت کتنی بھی عیاں اور ظاہر ہو، اس وقت تک ہماری سمجھ میں نہیں آتی جب تک اس کی ضد اور مقابل موجود نہ ہو اور دونوں کا باہم موازنہ نہ کیا جائے۔ صرف یہی ایک بات اس کیلئے کافی ہے کہ آدمی غیر معلوم حقائق کی تکذیب کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے۔

فصلِ بہار میں زمین کی حیاتِ نو کو قرآن کریم میں توحید کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اور کبھی قیامت کے ایک چھوٹے سے نمونے اور موت کے بعد زندگی کی مثال کے طور پر خداوند تعالیٰ انسان کو تنبیہہ فرماتا ہے کہ جس طرح زمین کے محدود نظام میں موت و حیات دونوں ہیں۔ جس طرح بیج جو ایک فصل میں زمین میں بویا جاتا ہے۔ سال کی دوسری فصل میں اگتا اور بڑھتا ہے۔ جس طرح بیج ایک خاص وقت میں جامد اور بے جان نظر آتا ہے پھر دوسرے موقع پر وہی بیج زندہ اور جاندار بن کر ابھرتا ہے۔ یہی حال کائنات کے وسیع تر نظام کا ہے اور یہی صورت عمومی موت کے بعد زندگی اور مجموعی حشر و نشر کی ہے۔

**حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ**

اور جس دن ہم ہر قوم سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی اُٹھائیں گے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ جب وہ آئیں گے اللہ ان سے کہے گا: کیا تم نے میری ان نشانیوں کو جھٹلایا تھا جن کا تم کو پورا علم نہیں تھا۔ (سورہ نمل، آیت۔ ۸۴)

جو چیز اکثر ہوتی رہتی ہے وہ معمولی بن جاتی ہے اور اس کی اہمیت نظروں سے گر جاتی ہے۔ زمین کا



مرنا اور پھر زندہ ہونا بھی اسی قسم کی بات ہے۔ ہماری عمر طبیعی کا بھی یہی حال ہے۔ ہم اپنی زندگی میں دسیوں بار اس معمول کو دیکھتے ہیں، اس لیے ہماری نظر میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔

ہمارے اردگرد متعدد چھوٹے بڑے نظام موجود ہیں۔ ہمیں کسی طرف سے بھی معلوم نہیں کہ ہم کہاں تک جا سکتے ہیں اور کس حد تک ان سے واقفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ چھوٹے نظام میں ہم خلیے، سالمے اور جوہر تک پہنچتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم اور آگے کہاں تک جائیں گے۔ اس سے بڑے نظام میں ہم نے نظام شمسی اور اس نظام کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں جس کا نظام شمسی ایک حصہ ہے اور جس کے وہ تابع ہے۔ اب ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ نظام کس نظام کے تابع ہے اور اس سے آگے یہ سلسلہ کہاں تک چلتا ہے۔

اس لحاظ سے ہماری اور اس کائنات کی مثال اس کیڑے کی سی ہے جو کسی سیب یا کسی لکڑی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی دنیا اور اس کے زمین و آسمان وہی پھل یا لکڑی ہیں۔ سیب کے کیڑے کو معلوم نہیں کہ یہ سیب جزو ہے، اس نظام کا جس کا نام درخت ہے اور وہ درخت خود جزو ہے ایک اور بڑے نظام کا جس کا نام باغ ہے اور اس باغ کا کوئی مالی اور کوئی سرپرست ہے جس نے باغ لگایا ہے۔ پھر وہ باغ ایک دیہات کا حصہ ہے اور وہ دیہات ایک ملک کا حصہ ہے اور وہ ملک کرۂ ارض کا ایک حصہ ہے اور کرۂ ارض فضائے لامتناہی کا ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔ یہی حال اس مکڑی کا ہے جو کسی کمرے کی چھت میں پیدا ہوتی ہے اور وہیں مرجاتی ہے۔ اسے قطعاً معلوم نہیں کہ یہ کمرہ ایک مکان کا جزو ہے اور وہ مکان ایک شہر کا جزو ہے اور شہر ایک ملک کا جزو ہے۔ **علیٰ ھذا القیاس**

قدرتی طور پر انسان کی نسبت کیڑوں کا ادراک اور فہم بہت کم اور محدود ہے۔ انسان کیلئے جو بات بدیہی اور مسلم ہے، وہ ان کیلئے ناقابل یقین ہے مگر جس عالم میں انسان اپنی زندگی گزارتا ہے، اس سے بڑے عالموں کی نسبت اس کا بھی یہی حال ہے۔ رومی کہتے ہیں:

جو کیڑا لکڑی کے اندر پیدا ہوا ہے اسے اس وقت کا حال کیا معلوم جب یہ لکڑی ایک چھوٹا سا پودا تھی۔ جو مچھر موسم بہار میں باغ میں پیدا ہوا اور وہیں مرجائے گا، اس کو کیا معلوم باغ کس کا ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ گھر ناپائیدار ہے۔ مکڑی جو اس گھر میں رہتی ہے اسے کچھ خبر نہیں۔

یہ صورت تو ہے اس وسیع دنیا کی کہ ہمیں اس کے بارے میں بہت کم معلوم ہے لیکن دوسری دنیائیں

جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ہماری زندگی کی تدبیر و تقدیر ان سے وابستہ ہے، ان کے بارے میں تو ہماری معلومات بے حد کم ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو ہماری اس دنیا کو وہی نسبت ہے جو عالمِ خواب کو عالمِ بیداری سے ۔

غزالی کی جو روحانی کایا پلٹ ہوئی تھی، اس کے ضمن میں انہوں نے بھی خواب ہی کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم خواب میں ایک دنیا دیکھتے ہیں لیکن اس حالت میں ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ دراصل یہ حالت بھی ہمارے نظام زندگی کا ایک حصہ ہے، گو اصل بیداری ہے۔ جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو ہمیں اس حالت کے جزوی ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ ہماری دنیوی زندگی دوسری زندگی کے مقابلے میں ایک خواب ہی ہے۔ ہمارا یہ یقین کہ دنیوی زندگی ہی اصل ہے، اس یقین سے زیادہ کچھ نہیں جو خواب دیکھنے والے خواب کی حالت میں ہوتا ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ جب ہم جاگتے ہیں، اس وقت سمجھتے ہیں کہ دنیوی زندگی حقیقت نہیں تھی محض خواب و خیال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ بے حقیقت ہے۔ کامل زندگی کے دو حصے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا حصہ خواب ہے۔ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اگر وسیع تر زندگی کا خیال کیا جائے تو یہ ایک خواب ہے۔

**الناس نیام فاذاماتوا انتبھوا**

لوگ خواب میں ہیں، مرنے کے بعد جاگتے ہیں

بقول رومی یہ دنیا سوتے ہوئے کا خواب ہے۔ سوتا ہوا شخص خواب ہی کو حقیقت سمجھتا ہے۔ جب موت آ پہنچتی ہے تب وہم و گمان کے اندھیروں سے نجات ملتی ہے۔ اس دنیا میں خواب میں جو کچھ کیا تھا، جاگنے پر وہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

**الدنیا مزرعة الاخرة**

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جو ہم یہاں بوتے ہیں وہی وہاں کاٹتے ہیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے خیالی میں گیہوں کا کوئی دانہ آدمی کے ہاتھ سے گر کر مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ کسان گیہوں کو بھوسے سے جدا کرتا ہے اور بھوسے کو مٹی میں ملا کر لیپنے کے کام میں لے آتا ہے۔ اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس میں گیہوں کا کوئی دانہ بھی موجود ہے لیکن جب خریف کی فصل آتی ہے وہ دانہ جو



نظر نہیں آ رہا تھا، خاک سے سر نکالا ہے، اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ کہتا ہے: میں وہی ہوں جسے تو سمجھتا تھا کہ گم ہو گیا۔ یہاں کچھ گم نہیں ہوتا۔

**يَاوَيْلَتَنَا مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا**

(جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے سب اعمال لکھے ہوئے موجود ہیں تو) وہ کہیں گے کہ "یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی چیز چھوٹی ہے نہ بڑی، سب کو گنوا دیا ہے"۔ (کھف:۴۹)

ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے تو یہ طے کرے کہ اس کے سوچنے اور سمجھنے کی حدود کیا ہیں، دونوں لحاظ سے بحیثیت ایک انسان کے بھی اور ذاتی اور شخصی لحاظ سے بھی، اپنی قابلیت کا اندازہ لگانے کے بعد اس کی حدود میں رہتے ہوئے اگر وہ کسی چیز کی تصدیق یا تکذیب، اقرار یا انکار کرے گا تو اس وقت غلطی اور لغزش سے محفوظ رہے گا۔

## سوالات

سوال ۱۔ علم کے کتنے درجے ہیں؟

سوال ۲۔ امام صادقؑ کی حدیث کے مطابق انسان کے خدا سے دو عہد کونسے ہیں؟

سوال ۳۔ ناقص علم کا ہونا بہتر ہے یا علم کا نہ ہونا؟

سوال ۴۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے سے کیا مراد ہے؟